قسط اوّل

اُسوۂ حسینی

آیۃ اللہ العظمٰی سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

بِسۡمِ اللہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

اَلۡحَمۡدُ لِلہِ رَبِّ الۡعٰالَمِیۡنَ وَ الصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ وَ آلِہِ الطَّاهِرِیۡنَ مِنۡ یَوۡمِنَا هٰذَا اِلٰی یَوۡمِ الدِّیۡن۔

تمہید

انسان کو کمالِ انسانی کی منزل تک پہنچانے کے لیے رب العالمین کی طرف سے جو سلسلہ انبیاء و مرسلینؑ کا قائم ہوا تھا اس کی انتہا حضرت خاتم النبین وافضل المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر ہوئی اور آپ نے تعلیمات الٰہی کا ایک خزانہ قرآن مجید کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ مگر کتاب علم کا سرمایہ بن سکتی ہے۔ عمل کے لیے تربیت درکار ہے اس لیے پیغمبرؐ کے ذمہ تلاوتِ کتاب کے ساتھ تزکیۂ نفوس اور تعلیم کتاب وحکمت کا فریضہ بھی عائد کیا گیا اور آپ کے سیرت و کردار کو خلقِ خدا کے لیے نمونہ بنایا گیا جس کے لیے قرآن میں یہ آیت آئی کہ:

قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللہُ ۔

(اے رسولؐ) ان سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا۔

اس طرح اسوۂ رسولؐ تمام مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہوا۔ مگر رسالت مآبؐ کی بشری زندگی محدود تھی۔ آپ کی وفات کے بعد بھی ضرورت تھی کہ اس کتاب ہدایت قرآنِ مجید کے ساتھ ایسے افراد رہیں جو اخلاق و کمالات میں رسولؐ کے جانشین اور آپ کی طرح دنیا کے لیے نمونۂ عمل بننے کے قابل ہوں، جن کی عملی سیرت کا اتباع بعد سیرتِ رسولؐ نجات وفلاح کا ذمہ دار ہو اور اس طرح وہ قرآن کے ساتھ اور قرآن ان کے ساتھ ہو۔ ان کے اتباع سے قرآن کا حقیقی اتباع اور قرآن پر عمل کرنے سے ان کے دامن سے تمسک ہوتا ہو۔ یعنی کسی طرح ایک دوسرے سے جدا نہ ہو سکے۔ اسی کے بتانے کے لیے رسولؐ نے اپنی وہ مشہور حدیث ارشاد فرمائی کہ ''اِنِّیۡ **تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اهل بیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلوا بعدی انهما لن یفترقا حتیٰ یردا علی الحوض**''

بے شک یہ وہ افراد تھے جن کو رسالت مآبؐ نے اپنے بعد کے لیے دنیا میں نمونۂ عمل قرار دیا تھا اور یہ منظور تھا کہ دنیا اپنی عملی زندگی میں ان کی پیشوائی کو قبول کر کے ان کے نقشِ قدم پر گامزن ہو اور اس طرح کامیابی کے حقیقی نقطۂ ارتقاء پر فائز ہو۔

مگر فرض کے طور پر کسی پابندی کا عائد ہونا اور کسی کے اتباع واطاعت کا اپنے اوپر لازم و واجب سمجھنا ایک ایسی چیز ہے جو انسانی طبیعت پر گراں گزرتی ہے۔

اس صورت میں اطاعت کا مقصد حاصل تو ہو جاتا ہے مگر ناخوشگواری و گرانی کی بناء پر انسانی طبیعت کو اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی فکر ضرور رہتی ہے اور اس لیے کمزور طبائع کے

لوگ خواہش کے مقابلہ میں فرض شناسی کو چھوڑ کے معصیت کے مرتکب بھی ہوجاتے ہیں۔

لیکن اگر یہی فرض کی پابندی کسی طبعی نظام کے تحت میں آکر انسانی خواہش کے مطابق بن جائے اور انسان کی فطرت کے اعتبار سے اس کے مناسبِ طبع و مذاق ہوجائے تو پھر وہ فرض ایک خوشگوار ذاتی خواہش کے لباس میں آکر انسان کے لیے بارِطبع باقی نہیں رہتا اور انسان اسے خوشی خوشی بشاش چہرہ و بشرہ کے ساتھ بجالانے میں لذت محسوس کرتا ہے۔

خدا و رسولؐ انسانی افتادِطبع اور اس کے خصوصیات سے پورے طور پر باخبر تھے۔ انہیں رسولؐ کے بعد کچھ افراد کو نمونۂ عمل بنانا تھا اور ان کے اتباع و اطاعت کو فرض قرار دینا تھا لہٰذا ایسے اسباب قرار دینا تھے جو ایک انسان کی طرف لوگوں کے جذبِ قلب کا باعث اور اس کے افعال و اقوال کو مرکزِ توجہ بنا کر ان کے اتباع و اقتداء کی طرف متوجہ کرنے والے ہوں۔

چنانچہ وہ تمام وجوہ و اسباب جن سے ایک انسان کی پیروی اور متابعت کی طرف دلوں کی توجہ پیدا ہوتی ہے۔ اہلِ بیت رسولؐ کے لیے مجتمع کر دیئے گئے۔

پہلا سبب ایک انسان کی طرف جذب کا ہوتا ہے محبت، بڑے سے بڑا کام جو طبیعت پر گراں گزرتا ہو، محبت کے واسطہ سے لیا جائے۔ تو وہ آسان معلوم ہوگا۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کی باتوں کو مانتا ہے اور اس کے اقوال پر عمل پیرا ہوتا ہے اس سے محبت کرتا ہے تو اس کے افعال سے بھی محبت کرتا ہے اور خود ان کے اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اہلِ بیت رسولؐ کے لیے اس پہلو پر زور دیا گیا اور مختلف طرح، مسلمانوں کو ان کی محبت پر آمادہ کیا گیا۔ رسولؐ نے خود محبت کا اظہار کیا اور ایسا کہ جس کی نظیر ملنا ممکن نہیں۔ خالق کی محبت کا اعلان کیا اور ہر طرح قول سے، عمل سے، قرائن سے آثار سے اس کو نمایاں فرمایا۔ پھر مسلمانوں کو محبت کی دعوت دی۔ ان کی محبت اجرِ رسالت ان کی محبت شرطِ ایمان و اطاعت اور ان کی محبت معیارِ فلاح و نجات قرار دی گئی یہ مسلمانوں کے غور کرنے کی بات ہے کہ آخر رسالت مآبؐ کا اس قدر اظہارِ محبت اور تاکید مودت کرنا اپنے مخصوص اہل بیتؑ اور عترتِ طاہرینؑ کے متعلق معنی کیا رکھتا ہے؟

کیا یہ سب کچھ صرف اس بناء پر تھا کہ وہ آپ کے اہل بیتؑ تھے۔ یعنی ان میں ایک آپ کی بیٹی تھیں۔ ایک آپ کے داماد اور دو آپ کے نواسے تھے؟ کیا صرف عزیز، قریب اور اولاد ہونے کی بنا پر آپ کوشاں تھے کہ دنیا ان کی گرویدۂ محبت ہوجائے؟

یہ تو حضرت رسولؐ کے بارے میں کچھ اچھا عقیدہ نہیں ہے۔

آپ دنیا میں مبلغِ شرع اور مصلحِ خلق بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپ کا فرض تھا کہ آپ دنیا کو ان باتوں کی ہدایت کریں جو ان کے فلاح و نجاح کی ضامن ہوں اور ان کی زندگی کے مہذب و شائستہ بنانے میں دخیل ہوں۔ اس لیے اپنی شخصیت اپنے منتسبین اور اپنے اعزاز کے رسوخ و اقتدار کو بڑھانا، ان کی طرف لوگوں کے قلوب کو متوجہ کرنا اور دنیا کو ان کا گرویدہ بنانا صرف اس لیے کہ وہ آپ کے عزیز اور رشتہ دار ہیں۔ نفس پروری خودغرضی اور جانبداری کا ایک مظاہرہ ہوگا۔ جو کسی طرح شانِ رسولؐ کے لائق نہیں ہے۔

ایک مسلمان کو تو یہ سمجھنا لازم ہے کہ رسالت مآبؐ کا ان حضرات کی محبت و الفت کی تبلیغ میں اس قدر اہتمام کرنا اسی لیے تھا کہ خدا ان کو مقتدائے خلق اور عملی تعلیمات کا نمونہ بنانا چاہتا تھا۔ اس لیے رسولؐ ان کی ہر دلعزیزی میں اس قدر کوشش و اہتمام میں منہمک تھے۔ آپ نے محبت کا بیج بویا تھا اس لیے کہ اس سے نہالِ اطاعت بارآور ہو۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ کثرتِ فضائل۔ ایک انسان جس کی

عظمت اس کے مختلف ذاتی خصوصیات و کمالات کے اعتبار سے انسان کے ذہن نشین ہو چکی ہو۔ اس کے افعال و اعمال کو انسان بہت غائر نظر سے دیکھتا اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اہل بیتِ رسولؐ کو یہ خصوصیت بھی انتہائی معراجِ کمال پر واصل کرتی ہے اور رسولؐ نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ان حضرات کے بیان فضائل میں صرف کیا۔ اگر ان کی شخصیتوں کو کوئی ذمہ دارانہ حیثیت دینا منظور نہ تھا، اگر انہیں عام رعیت سے بلند کسی خاص درجہ تک بتانا مقصود نہ تھا تو ان کی شخصیتوں کو اس امتیازی شان سے دنیا میں روشناس کرانے کا کیا مقصد تھا اور ان کے فضائل اس شدومد سے بیان کرنے کی وجہ کیا تھی؟

یقیناً یہ فضائل کا بیان بھی اسی بناء پر تھا کہ یہ مربیٔ خلق اور نمونۂ عمل ہیں لہٰذا ان کے کمالات کو بیش از بیش صورت پر واضح کرنے کی ضرورت تھی۔

تیسرا سبب کسی شخص سے اغراض کا وابستہ ہونا، یہ ایسی چیز ہے کہ انسان کے لیے دوسرے کی طرف جذب ہونے کا باعث اور اس کے افعال و اقوال کی اقتدا کا ذریعہ ہوتی ہے۔

اس خصوصیت کو بھی اہل بیتؑ کے لیے نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مسلمانوں کی نظر میں بے شک دنیا سے زیادہ آخرت کا سوال مقدم ہے۔ اس لیے دنیا کے نہیں، آخرت کے اغراض اہل بیتؑ سے وابستہ قرار دیئے گئے اور ساقیٔ کوثر حاملِ لوا، قاسمِ جنت و نار، شافعِ خلق وغیرہ الفاظ کے ساتھ ان کے روحانی اقتدار کا سکّہ قائم کیا گیا۔ اس سے بھی یہی منظور تھا کہ دنیا ان توقعات کی بنا پر ہی اطاعت و اتباع پر آمادہ ہو سکے۔ اس لیے کہ کسی سے اعانت، امداد سفارش کی توقع اسی وقت حق بجانب ہوتی ہے جب انسان اس کے مسلک کا سالک، اس کے افعال و اقوال کا پیرو بھی ہو۔ انعامات کے لیے جس طرح استحقاق کی ضرورت ہے اسی طرح مراعات بھی ایک جہتِ استحقاق پر مبنی ہوتی ہے۔ مراحم خسروانہ کے سلسلہ میں آزادیاں ہوتی ہیں لیکن جرائم پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ بعض جرائم اتنے سنگین ہوتے ہیں کہ مراحم خسروانہ کے تحت میں بھی عفو کے قابل نہیں ہوتے معلوم ہوتا ہے کہ مراحم خسروانہ میں بھی استحقاق کو دخل ہے۔

شفاعت، سقایتِ کوثر وغیرہ تمام چیزیں ہیں لیکن انہی لوگوں کے لیے جو استحقاق رکھتے ہوں، ان کے لیے نہیں جن کے اعمال دیکھ کر خود شفیعِ اکرمؐ کو شرم آجائے اور وہ شفاعت سے کنارہ کشی کر لیں۔ اس لیے بہرحال اتباع کی ضرورت ہے۔ تاکہ شفعاء سے آنکھیں چار کرنے کا موقع رہے پھر ناقص انسانیت کی کمزوریوں سے اگر کچھ فروگذاشتیں رہ جائیں تو اس کے لیے شفاعت و مغفرتِ الٰہی کی توقع رکھنا بے جا نہیں ہے۔

چوتھا سبب ہے مظلومیت، یقیناً مظلوم کی طرف دنیا کا دل کھنچتا اور اس کے افعال و اقوال کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور اس سے بھی اطاعت و اتباع کے مقصد کو تقویت پہنچتی ہے۔

یہ صفت بھی اہلِ بیتِ رسولؐ میں انتہائے حدِ کمال کے ساتھ پائی گئی اور جیسی مظلومیت کی مثالیں ان میں نظر کے سامنے آئی ہیں دنیا ان کی مثال پیش کرنے پر قاصر ہے۔

بیان مذکور الصدر کے آخری اجزاء کو غائرِ نظر سے مطالعہ کرنے سے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ دنیائے فضائل و مناقب اور دنیائے مصائب دونوں میں ایک ہی روح مضمر ہے اور وہ دعوتِ عمل ہے جس سے اصلاحِ خلق کا مقصد انجام پذیر ہوتا ہے۔ لیکن یہ جب ہی ہے کہ جب اہل بیتؑ کے واقعات کو اس نظر سے دیکھا بھی جائے کہ ان سے کون سے سبق حاصل ہوتے ہیں اور انسان کی عملی زندگی کے لیے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ دنیا ان مقاصد پر نظر نہیں ڈالتی اور اہل بیت رسولؐ کے تذکرہ ان کی یادگار اور اسی ذیل میں عزائے

حضرت امام حسینؑ کے متعلق دو فریق میں منقسم ہو جاتی ہے۔

ایک فریق معترضانہ طور پر اس ذریعہ کی ذاتی حیثیت پر نظر ڈال کر افادی حیثیت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

اس لیے اس سب کو بیکار کہنے لگتا ہے اور دوسرا فریق معتقدانہ طور پر اس کی ذاتی حیثیت کو مقصد سے الگ کر کے اسے صرف رسوم میں محدود سمجھ لیتا ہے اور اس طرح اصل مقصد کو فوت کر دیتا ہے۔

اسوۂ حسینیؑ کو سمجھنے کی ضرورت

اہل بیت معصومینؑ کی تمام زندگی کی سیرت میں سے کوئی شک نہیں کہ سب سے زیادہ تقریر اور تحریر میں حوالہ ''اسوۂ حسینیؑ'' کا دیا جاتا ہے اور تاریخ میں نمایاں بھی اتنا ہے کہ بے ساختہ ہر موقع پر ذہن اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ مگر عموماً دنیا نے ''اسوۂ حسینیؑ'' کو صحیح طور پر سمجھا نہیں ہے۔ لوگ ہمیشہ کسی ہنگامۂ انقلاب، کسی حرکتِ عمل، کسی خطرناک اقدام اور ساکن فضا میں تحریک کے لیے حضرت امام حسینؑ کے نام اور کام کا حوالہ دیا کرتے ہیں۔

حالانکہ اسوۂ حسینیؑ جس کا نام ہے وہ کوئی ایک دن کا ایک ہنگامی عمل نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک حکیمانہ ستاون برس کی زندگی کا متوازن کارنامہ ہے۔ جس کی آخری کڑی وہ تھی جو ۶۱ھ کی دسویں محرم کو ہماری آنکھوں کے سامنے آئی۔

ذیل میں جو کچھ ہے وہ اسی ''اسوۂ حسینیؑ'' کے واضح کرنے کی کوشش ہے۔ جس سے ثابت ہوگا کہ ''اسوۂ حسینیؑ'' حقیقت میں اپنے پیش رووں سے الگ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ہی اسوہ ہے۔

جیسے اسوۂ ''محمدیؐ''، ''اسوۂ علویؑ'' اور ''اسوۂ حسنیؑ'' بھی کہہ سکتے ہیں اور وہی وقت آنے پر ''اسوۂ حسینیؑ'' کی بھی شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے۔

اسوۂ حسینیؑ کا ہمہ گیر پہلو
رواداری اور امن پسندی کے ساتھ
حمایتِ باطل سے علیٰحدگی

دو چیزیں ہیں اصول اساسی جو پیشوایانِ اسلام اور رہنمایانِ ملت کے طرز عمل میں توام رہی ہیں اور اسلام کے تعلیمات میں بھی وہ خاص طور سے کارفرما ہیں۔ وہ دونوں عنصر اگر پہلو بہ پہلو نہ ہوں تو انسان کا طرزِ عمل یا تو حدِ اعتدال سے باہر نکل جائے یا تفریط کے دائرہ میں رہ جائے۔ اس لیے کہ ہر وقت خاموشی یا ہر وقت حرکت یہ دو باتیں ایسی ہیں جن میں سے پہلی انسان کے لیے بعض اوقات بزدلی، فرض شناسی سے علیٰحدگی اور ادائے فرض میں کوتاہی اور دوسری اکثر اوقات فتنہ و فساد کا باعث ہوتی ہے۔ انسان کی زندگی میں نہ ہر وقت خاموشی کا ہوتا ہے اور نہ ہر وقت متحرک ہونے کا۔ بلکہ ہر ایک کے لیے کچھ حدود اور کچھ معیار ہیں۔ جس موقع پر بیٹھے رہنے کی ضرورت ہو۔ وہاں بیٹھ جانا ہی اخلاق کی جان ہے اور جب کھڑے ہونے کا موقع ہو تو کھڑا ہونا اخلاق کی روح ہے۔

وہ دو اصول اساسی یہ ہیں جنہیں ہر مسلمان کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک امن و امان کی ضرورت دوسرے حمایتِ باطل سے علیٰحدگی۔

امن و امان جسے ہمیں اپنے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ ''جیو اور جینے دو'' اسی کو فارسی میں ''مرنجاں مرنج'' کہا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت وہ چیز ہے جس پر تعلیمِ اسلام کی بنیاد واقع ہوئی ہے۔ اسلام مشتق ہے۔ ''سلم'' سے ''سلم'' کے معنی ہیں صلح پسندی۔

رسول اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: ''**المسلم من سلم المسلمون بہ یدہ و لسانہ**'' کہیں کہیں یہ بھی میری نظر سے گزرا ہے کہ ''**المسلم من سلم الناس من یدہ و لسانہ**''۔

اصلی مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے اس کے برادران محفوظ رہیں۔ اب خواہ وہ برادرانِ جامعۂ انسانیت ہوں یا برادرانِ جامعۂ مذہب۔ یہ تعلیم وہ ہے جو نظامِ انسانی اور تعلیماتِ اسلامی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یعنی خواہ مخواہ تمہارے ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ تم کسی سے برسر پیکار نہ ہو۔ جہاں تک تمہارے امکان میں ہو خونریزی سے علٰحدہ رہو۔ کبھی اپنی طرف سے فتنہ و فساد کا سبب نہ بنو۔ دو الفاظ ہیں جو معتقدین اسلام کے لئے بڑی اہمیّت رکھتے ہیں۔ ایک ''مسلم'' اور ایک ''مومن''۔ مسلم ''سلم'' سے مشتق اور مومن ''امن'' سے مشتق اس لئے یہ بھی ارشاد ہوا کہ ''**المؤمن من امنه المسلمون علٰی دمائهم و اموالهم**'' امن پسندی بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ زبانی تعلیمیں برابر اس کے متعلق دی گئیں۔ عملاً اس کی پابندی کر کے ہدایت کی گئی۔ اس کا دائرہ یہاں تک وسیع ہے کہ غیر مسلم کے ساتھ بھی رواداری برتنے کا حکم ہے صلح پسندی سے کام لینے کی ہدایت ہے۔ غیر مسلم اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام میں رواداری نہیں ہے۔ لیکن یہ حقیقت حال سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

جناب رسالت مآبؐ کے سچے شاگردِ روحانی یعنی حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام مالک اشترؒ کو مصر کا حاکم بنا کر بھیج رہے ہیں۔ اس موقع پر ایک عہد لکھ کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کو اپنا لائحہ عمل بنانا۔ اس میں فرماتے ہیں: ''**لا تکونَنّ علیهم سبعا ضاریا تغتنم اکلهم فانهم صنفان اما اخ لک فی الدین او نظیر لک فی الخلق**''۔ تم اہل مصر کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار نہ کرنا کہ معلوم ہو تم درندہ حیوان ہو جو انہیں کھا لینا چاہتا ہے اس لیے کہ وہاں کے لوگ دو ہی قسم کے ہیں۔ یا تو تمہارے مذہبی بھائی ہیں اور یا خلقت یعنی جامعۂ انسانیت میں تمہارے شریک ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مساوی طور سے ہر فریق کے ساتھ رواداری کی ہدایت ہو رہی ہے۔

دوسری بات جو سب سے بڑی اور اہم اسلام کی ہدایت ہے وہ یہ ہے کہ حق پر قائم رہو اور باطل کی کبھی حمایت نہ کرو۔ تقویت باطل کی ذمہ داری تمہاری طرف عائد نہ ہونے پائے۔ یہ بھی وہ چیز ہے جس پر جناب رسالت مآبؐ اور ان کے پیروانِ حقیقی کے سیرت کی بنیاد قائم ہے۔

امن پسندی اور امن پسندی کے ساتھ ساتھ حمایتِ باطل سے علٰحدگی یہی دو عنصر آپ کو ساتھ ساتھ حضرت رسولِ اکرمؐ اور آپ کے اہل بیتؑ کے طرزِ عمل میں ملیں گے۔ یعنی جہاں تک اپنے اوپر حمایتِ باطل کا الزام نہ آتا ہو۔ اس وقت تک چاہے جتنے بھی نقصانات برداشت کرنا پڑیں اور اپنے ذاتی مفاد کی حیثیت سے دبنا بھی پڑے امن پسندی قائم رہے لیکن جس وقت خاموشی میں حمایتِ باطل کی صورت پیدا ہو بس وہیں سے خاموشی کی مہر ٹوٹ جائے اور جس حد تک اقدام ضروری ہو یعنی جس حد تک آگے بڑھنا اس باطل پروری کے الزام سے الگ کر دے وہاں تک اقدام عمل میں لائیں۔ یہ چیز ہے جو رسالت مآبؐ کے طرزِ عمل میں بھی نمایاں ہے اور وہی آلِ رسولؐ کی سیرت میں بھی روشن حروف میں نظر آتی ہے۔

میں جس وقت تاریخ کی روشنی میں نظر ڈالتا ہوں اور رسالتؐ مآب حضرت علیؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے طرزِ عمل کو دیکھتا ہوں تو عمل کے بالکل ملتے جلتے نمونے نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آئینے متعدد ہیں مگر صورت جو ان میں نظر آ رہی ہے ایک ہے۔ کسی موقع پر صلح اور کسی موقع پر جنگ، انہی دو اصولوں کی آمیزش کا نتیجہ تھی یعنی امن پسندی اور حمایتِ باطل سے علٰحدگی۔ مگر عام انسانی طبائع نقطۂ اعتدال پر نہیں ہوا کرتے۔ ان میں اکثر جذبات پائے جاتے ہیں اور جذبات اکثر عقل و تدبر سے الگ ہوتے ہیں۔ اس لیے صلح کے موقع پر من چلی طبیعتیں صلح کو قابلِ اعتراض سمجھتی اور جنگ کے موقع پر

کمزور طبیعتیں جنگ کو ناقابلِ قبول خیال کرتی ہیں۔ مگر وہ افراد جن کے طرزِ عمل کبھی جذبات کے پابند نہیں ہوتے تھے بلکہ ہمیشہ عقل کے پابند تھے وہ صلح کے موقعہ پر جذبۂ انتقام سے مغلوب نہیں ہوجاتے تھے اور جنگ کے موقع پر کمزوری میں گرفتار نہیں ہوتے تھے۔

صلح اور جنگ کے مختلف نقشے

(۱)

رسالتؐ مآب کا طرزِ عمل

حدیبیہ کی صلح اور امن پسندی کا بہترین مظاہرہ

جناب رسالت مآبؐ نے اذیتیں برداشت کیں اور تکلیفیں اٹھائیں۔ ارشاد فرمایا ہے: **﴿ما اوذی نبیٌ قط کما اوذیت﴾** کسی نبی کو اتنی ایذائیں نہیں دی گئیں جتنی ایذائیں مجھ کو پہنچائی گئیں۔

پتھر پھینکے جاتے تھے اور آپ کا جسدِ مبارک زخمی ہوجاتا تھا۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ پتھروں کے اندر چھپ گئے ہیں۔ کبھی سر اور روئے مبارک پر خون جاری ہوجاتا تھا لیکن زبان کلمۂ حق کے ساتھ گویا رہتی تھی۔ **{قولوا لا الٰه الا اللہ تفلحوا}** کی آواز بلند تھی۔ اس ثبات قدم اور استقلال کے ساتھ اذیتیں برداشت کرنے اور اعلائے کلمۂ حق کی آواز تمام دنیا میں گونج اٹھی اور انہی کو جو آپ سے برسر پیکار تھے آپ کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔

اشاعتِ دین کے لیے ایک مناسب تر جگہ دستیاب ہوگئی تو حضرتؐ نے مکہ معظّمہ سے ہجرت فرمائی اور خاموشی کے ساتھ مدینہ منورہ تشریف لے گئے یہ رواداری کا ثبوت تھا۔ اگر دیکھا جائے تو وہی انصار جو مدینہ منورہ میں آپ کی حمایت کے لیے موجود تھے۔ چڑھائی کر کے مکہ معظّمہ بھی آسکتے تھے۔ آپ مکہ میں رہ کر ایسے اسباب مہیا فرماتے جن کی بدولت آپ اپنی مخالف جماعت کو مغلوب کر سکتے۔ مگر آپ نے وہاں رہ کر کسی ایسے اقدام کا ارادہ نہیں کیا۔ یہ دکھانے کے لیے کہ تم جتنا بھی ہمیں آزار پہنچاؤ مگر ہم تم سے جنگ کرنا نہیں چاہتے۔ ہم بس اپنے اصول اور اپنی زندگی کو محفوظ کرتے ہوئے تمہارے درمیان ہی سے چلے جاتے ہیں۔

تمہیں ہمارا رہنا منظور نہیں ہے؟ اچھا ہم مدینہ کی طرف جاتے ہیں۔ اب تو ''جیو اور جینے دو'' کے اصول پر عمل کر کے ہم سے ہاتھ اٹھاؤ۔ مگر وہ جنہیں آپ کی زندگی مکہ معظّمہ میں گوارا نہ تھی انہیں آپ کی زندگی مدینہ منورہ میں بھی گوارا نہ ہوئی۔ وہاں بھی آپ پر چڑھائی کی جانے لگی۔ جب آپ نے دیکھا کہ اب اگر خاموش رہے تو وہ جنہوں نے پناہ دی ہے خطرے میں پڑ جائیں گے اور ان کا شہر ان کے قبضہ سے نکل جائے گا تو اب خاموشی جرم تھی۔ اب آپ نے تلوار اٹھائی۔ اس کے بعد بھی جہاں جہاں تک چڑھائی کر کے وہ آئے آپ نے مدافعت کی۔ چنانچہ جتنی لڑائیاں ہوئیں سب مدافعانہ ہی ہوئیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہا جب تک مشرکین کی طاقت میں رمق جان باقی رہی۔ ہر دفعہ وہ شکست کھاتے تھے اور پھر پہلی مرتبہ سے زیادہ طاقت کو بڑھا کر آتے تھے۔

بدر میں شکست ہوئی تو احد میں فوج کی تعداد بڑھا کر پوری طاقت سے حملہ کے لئے آئے اور جب پھر شکست ہوئی تو انفرادی طاقت کو کافی نہ سمجھ کر اطراف و جوانب کے قبائل اور یہود کی جماعتوں کے ساتھ متفق ہو کر رسولؐ کے مقابلہ میں آئے اور اس وجہ سے اس جنگ کو جنگِ احزاب کہتے ہیں۔ یعنی اس میں جتنی جماعتیں کفار کی تھیں سب متفق ہو کر رسولؐ سے برسرِ پیکار ہوئی تھیں۔ جب اس میں بھی شکست ہوئی تو ہمتیں پست ہوگئیں۔ اب قریش میں کسی جنبش کی طاقت نہ تھی۔ اس لئے اس کے بعد جو لڑائیاں ہوئیں وہ یہودیوں کے ساتھ ہیں۔ مشرکین مکہ اور قریش کے ساتھ آخری جنگ فیصلہ کن احزاب ہی کی تھی۔

اس کے بعد رسالت مآبؐ نے مکہ معظّمہ کا ارادہ کیا حج کے لئے ۔ آپ کے ساتھ بدنے (یعنی قربانی کے اونٹ(۱)) تھے جس سے صاف ظاہر تھا کہ آپ لڑائی کے لئے نہیں جارہے تھے۔

جس وقت مکہ معظّمہ کے قریب پہنچے گو قریش میں طاقت مقابلہ کی نہ تھی ہمتیں پست ہوچکی تھیں مگر عناد کی آگ فرو نہ ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ حج سے روکنے پر آمادہ ہوگئے اور خالد بن الولید کی قیادت میں جو اکثر مورخین کے قول کی بناء پر اب تک حالتِ کفر میں تھے ''کراع الغمیم'' مقام تک مقابلہ کے لئے آگئے۔

ملاحظہ ہو کہ رسالتؐ مآب کی فوج اور آپ کے ساتھیوں کی ہمتیں پے در پے فتوحات حاصل ہونے سے بڑھی ہوئی، مشرکین کی فوج کو متعدد بار شکست دیئے ہوئے۔ اس صورت میں رسالت مآبؐ کے لئے عام افتادِ طبع کی بناء پر یہ مناسب تھا کہ آپ اپنی فوج کو جو سلاح جنگ سے آراستہ تھی ہی حملہ کا حکم دے دیتے اور دشمن کو شکست دے کر مکہ معظّمہ پر قبضہ کرتے۔

مگر آپ کو یہ دکھانا منظور تھا کہ ہم جب مجبور کئے جاتے ہیں تب ہی لڑتے ہیں گرد و غبار اٹھتا ہوا نظر آیا۔ اصحاب کی نظریں اٹھیں، معلوم ہوا لشکر آرہا ہے۔ آپ نے فرمایا، اس راستے کو چھوڑ دو۔ دوسرے راستے سے چلو طبری نے لکھا ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا، کون شخص ہے جو ہم کو کسی دوسرے راستے سے نکال لے چلے۔ اس راہ کے علاوہ جس پر یہ ہیں۔

یہ اس بات کا ثبوت دینا تھا کہ ہمیں لڑنا نہیں منظور ہے۔ چنانچہ حضرتؐ نے داہنی جانب کارخ کیا ''حمض'' کی پشت پر ''ثنیۃ المرار'' سے ہوتے ہوئے ''حدیبیہ'' کو جو راستہ جاتا ہے ادھر متوجہ ہوئے۔

مخالف فوج کی پست ہمتی اسی سے ظاہر ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف عناد سے مشتعل ہوکر سامنے نکل آئے تھے۔ مگر لڑنے کے لیے تیار نہ تھے کہ انہوں نے جب دیکھا کہ رسالت مآبؐ نے راستہ بدل لیا تو وہ بھی واپس آگئے۔

یہ امن پسندی کا سب سے بڑا ثبوت تھا جو رسالت مآبؐ نے دیا۔

اب مشرکین نے اپنی طرف سے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا۔ عروۃ بن مسعود ثقفی آیا جس نے گفتگوئے صلح کا آغاز کیا۔ حالت یہ تھی کہ مغیرہ بن شعبہ حضرتؐ کے سر پر تلوار کا سایہ کئے کھڑے تھے۔ عروہ اثناء گفتگو میں اپنا ہاتھ باربار حضرت کے چہرہ کے قریب لاتا تھا جس طرح بے باکی سے باتیں کی جاتی ہیں۔ جب اس کا ہاتھ حضرتؐ کے چہرہ کے قریب آتا تھا۔ مغیرہ کی تلوار اس کے ہاتھ پر جھکتی تھی۔

عروہ نے خود کفار کے پاس جاکر کہا کہ میں نے کسریٰ، قیصر اور نجاشی بڑے بڑے سلاطین کے دربار دیکھے ہیں۔ مگر ان بادشاہوں کی ہیبت میری نظر میں اتنی نہیں سمائی جتنی اس رسولؐ کی۔ حضرتؐ کی صلح پسندانہ باتوں سے خوشگوار توقعات قائم ہوچکے تھے۔ سہیل بن عمرو قریش کا نمائندہ بن کر مختتم گفتگوئے صلح کے لیے حضرتؐ کے پاس بھیج دیا۔ اور اس نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ اس سال آپ واپس جایئے اور حج نہ کیجئے! اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ منزلوں کی مسافت قطع کرکے اتنی بڑی جماعت حج کے لئے آئی ہو اور اسے روکا جائے۔

مگر حضرتؐ نے فرمایا کہ اچھا ہم واپس چلے جائیں گے۔ یہ انتہائی صلح پسندی کا ثبوت ہے اس کے بعد ملاحظہ ہو کہ صلح نامہ کے شرائط کیا ہیں۔ عام الفاظ میں تو یہی کہنا چاہیے کہ آپ نے دب کر صلح کی۔ یعنی شرائط ایسے قرار دیئے جو کفار

---

(۱) طبری، ج، ۳، ص ۳۷۔

قریش کی مرضی کے مطابق اور بظاہر آپ کی مصلحت کے خلاف تھے مگر حضرتؐ نے ان سب کو منظور کیا اور تمام باتوں کا تحمل فرمالیا۔

وقت آیا کتابتِ عہد نامہ کا اور حضرتؐ نے امیر المومنین علیؑ کو صلح نامہ کی تحریر کا حکم دیا۔ آپ نے اپنی عادت کے مطابق کاغذ لیا اور سرنامہ پر ''**بسم اللہ الرحمن الرحیم**'' تحریر فرمایا۔ اس میں کون سی بات تھی؟ خدا کا نام تھا اور اسلامی نشان۔ مگر سہیل نے اعتراض کیا۔

''یہ **بسم اللہ الرحمن الرحیمؐ**'' ہم نہیں جانتے۔ وہی لکھو جو ہماری تحریروں میں لکھا جاتا ہے۔ ''**باسمک اللّٰھم**'' اگر یہ فقرہ کوئی غلط معنی رکھتا ہوتا۔ تو یہیں سے دوسرا شعبہ اسلام کی عملی تعلیم کا سامنے آجاتا۔ کہ حمایتِ باطل نہ ہونا چاہیے'' لیکن معنی کا کوئی فرق نہ تھا۔ اسم مظہر نہ سہی ضمیر خطاب سہی کہ ''خداوندا تیرے نام سے شروع کرتا ہوں'' بات ایک ہی تھی، لہٰذا حضرتؐ نے رواداری صرف فرمائی یہ دکھلایا کہ ہم لفظی بحث میں نہیں پڑتے، معنی پر نظر رکھتے ہیں۔ لہٰذا لکھا گیا۔

باسمک اللّٰھم۔ اس کے بعد جناب رسالت مآبؐ نے صلح نامہ کا مضمون بتانا شروع کیا اور امیر المومنینؑ لکھنے لگے فرمایا لکھو۔ **ھذا ما صالح علیہ محمد رسول اللہ سھیل بن عمرو**۔

''یہ وہ معاہدہ ہے جس کے اوپر صلح ہوئی، خدا کے رسول محمدؐ اور سہیل بن عمرو کے درمیان''۔ سہیل نے اعتراض کیا۔

''**لو شھدت انک رسول اللہ لم اقاتلک ولکن اکتب اسمک واسم ابیک**''

''ہم اگر آپ کو خدا کا رسولؐ سمجھتے تو آپ سے برسر پیکار کیوں ہوتے؟'' لہٰذا آپ بس اپنے اور اپنے والد کا نام لکھیے (رسولؐ اللہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔)

رسالت مآبؐ دنیا کو تعلیم دینا چاہتے تھے کہ واقعیت جو ہوتی ہے وہ ہزار پردوں میں بھی واقعیت ہی رہتی ہے۔ اپنے نام کے ساتھ کسی لقب کو ہٹا دینا یہ کسی حقیقت کو بدل نہیں سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں ہاں! یہی لکھو! میں تو ہوں ہی خدا کا رسولؐ! لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

یہ دوسری رواداری کی بہت بڑی مثال ہے۔ یہ دکھانا منظور ہے کہ مصالحت کے موقع پر کفار کے ساتھ بھی مساویانہ برتاؤ کرنا چاہیے جس طرح سے اس کا نام لکھا گیا اسی طرح اپنا نام لکھوایا۔ تحریر ہوا۔

''**ھذا ما صالح علیہ محمد بن عبداللہ سھیل بن عمرو**'' یہ وہ ہے جس پر صلح کی عبداللہ کے بیٹے محمدؐ نے عمرو کے بیٹے سہیل کے ساتھ۔''

اس کے بعد شرائط صلح درج کئے گئے۔ ایک شرط یہ تھی کہ دس برس تک ہمارے درمیان جنگ نہ ہوگی اس میں لوگ امن و امان کے ساتھ رہیں گے اور ایک دوسرے سے ہاتھ روکے رہے گا۔''

دوسری شرط یہ ہے جو عجیب شرط ہے کہ جو شخص قریش میں سے بغیر اپنے ولی کی اجازت کے رسول اللہؐ کے پاس چلا جائے (اکثر لوگوں کے بھائی بیٹے یا دوسرے عزیز مسلمان ہوجاتے تھے تو ان پر سختیاں ہوتی تھیں، وہ مدینہ منورہ چلے جاتے تھے، تو ایسے لوگوں کو آپ مشرکین کی طرف واپس کردیں گے۔ مگر جب آپ کے پاس سے کوئی نکل کر قریش کے پاس چلا جائے تو قریش واپس نہ کریں گے۔)

اس کے بعد جو شخص رسالت مآبؐ سے حلیف ہونا چاہے وہ آپ کا حلیف ہوجائے اور جو قریش کے ساتھ ہم عہد و پیمان ہونا چاہے وہ ان کے ساتھ ہوجائے۔

اس شرط کے ہونے کے ساتھ ہی قبیلہ خزاعہ کے نمائندے اپنی جگہ سے اٹھے اور اعلان کیا کہ ہم رسولؐ کے عہد و امان میں ہیں اور بنی بکر اٹھے، انھوں نے کہا ہم قریش

کے عہد و پیمان میں ہیں۔

اور یہ شرط ہوئی ہے کہ آپ اس سال واپس جائیں اور مکہ میں داخل نہ ہوں آئندہ سال ہم آپ کے لئے مکہ کو خالی کردیں گے اور آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ میں داخل ہوجایئے گا۔ اس شرط کے ساتھ کہ تین دن سے زیادہ قیام نہ ہو، اور آپ کے ساتھ اس طرح کے ہتھیار ہوں جو مسافر اپنے ساتھ رکھتے ہوں یعنی تلواریں نیام کے اندر، اس کے علاوہ اور کچھ آپ کے ساتھ نہ ہو۔''

اب آپ فیصلہ فرمایئے کہ رسولؐ کی طرف سے کتنی رواداری کی گئی؟ ایسا شخص جس کے ساتھ فوج و لشکر موجود ہو، لشکر بھی ایسا جس کے دل میں فتح مکہ کا خیال قائم ہو چکا ہو۔ اس لئے کہ آپ اس کے قبل خواب دیکھ چکے تھے جس کو آپ نے اپنے اصحاب سے بیان فرمایا تھا اور وہ یہ کہ آپ مکہ معظّمہ میں داخل ہوئے ہیں۔

اصحاب کو یقین تھا کہ مکہ ضرور فتح ہوجائے گا۔ اس سب کے باوجود رسولؐ نے بظاہر دب کر صلح کی۔

اس کا نتیجہ تھا کہ وہ بے چین طبیعتیں جو رسولؐ کی مصلحت کی تہ تک نہیں پہنچ سکتی تھیں بے تاب ہوگئیں۔ طبری میں ہے کہ:

''رسالت مآبؐ کے اصحاب مدینہ سے یہ سمجھ کر روانہ ہوئے تھے کہ ہم مکہ معظّمہ ضرور فتح کرلیں گے ایک خواب کی بناء پر جو جناب رسالت مآبؐ نے دیکھا تھا، اب جو انہوں نے دیکھا کہ صلح ہوگئی اور آپ واپس جارہے ہیں اور یہ پابندیاں آپ نے اپنے اوپر عائد کی ہیں تو لوگوں کے دلوں میں امرِ عظیم پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ ہلاکتِ ابدی میں واقع ہوجائیں۔ یعنی عقائد میں تزلزل ہوا اور ایسا کہ قریب تھا کفر میں مبتلا ہوجائیں۔(۱)''

اس ناراضگی کے مظاہرات میں سے ایک یہ تھا کہ جب رسالت مآبؐ نے معاہدہ سے فراغت حاصل کی تو تمام اصحاب سے فرمایا کہ اٹھو اور نحر کرو۔ پھر حلق کرو یعنی سروں کے بال منڈواؤ اور حج کو عمرہ سے بدل کر واپس چلو۔ مگر رسول حکم دے رہے ہیں اور کوئی تعمیل کے لیے نہیں اٹھتا۔ یہاں تک کہ حضرتؐ نے تین مرتبہ یہی فرمایا۔

جب کوئی کھڑا نہ ہوا تو آپ کبیدہ خاطر ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ام المومنین ام سلمہؓ کے پاس جو اس سفر میں آپ کے ساتھ تھیں تشریف لے گئے اور ان سے ان واقعات کا تذکرہ کیا۔ ام سلمہؓ نے عرض کیا کہ حضور چاہتے ہیں کہ ایسا ہو تو خود تشریف لے جایئے اور کسی سے کچھ کہے بغیر خود آپ اپنے شتر قربانی کو نحر فرمایئے اور حلق راس کرا لیجئے'' حضرتؐ کو یہ مشورہ پسند آیا اور آپ نے باہر آ کر کسی سے کچھ کہا نہیں، مگر آپ نے خود نحر و حلق سے فراغت فرمالی جب لوگوں نے یہ دیکھا تو چار و نا چار مجبور ہو کر کھڑے ہوئے اور انہوں نے ایک دوسرے کے سروں کو حلق کرنا شروع کیا مگر رنج اور صدمہ کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا ایک دوسرے کو قتل کر رہا ہے۔[۱]

بے شک تاریخ کے فقرات اس موقع پر بتلاتے ہیں کہ تمام صحابۂ کرام بلا استثناء اس صلح سے ناراض تھے اور ان کے دلوں میں شکوک و شبہات گردش کر رہے تھے، مگر واقعہ ایسا نہیں ہے۔ بعض ایسے بھی تھے جن کے دل میں شک پیدا نہ ہوا تھا۔

حضرت علی بن ابی طالبؑ کا تو ذکر ہی نہیں اس لیے کہ وہ تو کاتبِ صلح نامہ ہی تھے۔ بلکہ طبری کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سہیل ابن عمرو کفار کا نمائندہ اور رسالت مآبؐ کے نمائندہ حضرت علیؑ تھے۔

چنانچہ اس میں ہے کہ ''**انّ قریشا بعثوا سهيل بن عمرو و حويطبا فو لّو هم صلحهم و بعث النّبى صلى الله عليه و سلم علياً عليه السلام فى صلحه**''

(۱) طبری، ج، ۳، ص ۷۹۔

(۱) طبری، ج، ۳، ص ۸۰،

''قریش نے سہیل بن عمرو اور حویطب کو صلح کا اختیار دے کر بھیجا اور رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کو صلح کا مختار بنایا۔[1]''

اسی وجہ سے دوسرے سال جب رسالت مآبؐ مکہ معظّمہ میں داخل ہوئے اور تین روز کی مدت جس تک قیام کا وعدہ تھا منقضی ہوگئی۔ تو کفار قریش حضرت علیؑ ہی کے پاس آئے تھے اور کہا تھا کہ ''**قل لصاحبک اخرج عنا فقد مضی الاجل**''

''اپنے رفیق (رسولؐ) سے کہیے کہ بس اب مکہ سے باہر جائیے۔ مدت ختم ہوگئی۔''

اس کو سن کر رسالت مآبؐ مکہ سے تشریف لے گئے [2]

اس سے ظاہر ہے کہ کفارِ قریش صلح کا بڑا ذمہ دار حضرت علیؑ کو سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے قرار دادِ صلح کی یاد دہانی کے لئے آپ ہی کی طرف رجوع مناسب سمجھی۔ لیکن حضرت کے علاوہ دوسرے صحابہ بھی کچھ نہ کچھ ایسے تھے کہ جن کو کوئی شک وشبہ پیدا نہ ہوا تھا اور وہ ثبات واستقامت کے ساتھ اپنے مضبوط عقیدہ پر قائم رہے تھے۔

چنانچہ طبری میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ جب رسالت مآبؐ نے حکم دیا کہ تم سب کے سب تحلیق کرو تو پہلے لوگ آمادہ ہی نہیں ہوتے تھے۔ حضرتؐ نے دوسروں کو نظر انداز کر کے خود تحلیق فرمائی۔

(تحلیق کے معنی) ہیں سر کو استرے سے منڈوانا، اس کے خلاف صورت ایک ہے۔ ''تقصیر'' یعنی بالوں کو کہیں کہیں سے ترشوالینا)

توصحابہ چارو نا چار اٹھے مگر تاریخ میں ہے کہ ''**حلّق رجال لیوم الحدیبیه و قصّر اُخرون**'' کچھ لوگ ایسے تھے حدیبیہ میں جنھوں نے تحلیق کی اور باقی جتنے تھے سب نے تقصیر کی۔ یعنی بس تھوڑے سے بال ترشوانے پر اکتفا کی۔

حضرتؐ نے فرمایا:۔ ''**یرحم اللہ المحلقین**'' خدا اپنی رحمت نازل کرے محلقین یعنی بال منڈوانے والوں پر۔''

لوگوں نے کہا ''**والمقصرین یا رسول اللہ**'' اور تقصیر کرنے والوں پر۔'' آپ نے پھر فرمایا:

''**یرحم اللہ المحلقین**'' خدا رحمت نازل کرے محلقین پر'' پھر آواز آئی۔ ''**والمقصرین یا رسول اللہؐ**'' خدا کے رسولؐ! بہت سے لوگ مقصرین بھی تو ہیں، ان کے لیے بھی تو ارشاد فرمایئے۔'' حضرت نے فرمایا ''**والمقصرین**'' اچھا مقصرین بھی سہی۔''

اب یہ تاریخ کا فقرہ قابل ملاحظہ ہے جو حقیقت حال اور صورت واقعہ کا آئینہ بردار اور پورے طور سے مظہر ہے کہ لوگوں نے عرض کیا۔ یارسول اللہؐ آپ نے محلقین کے لیے تین مرتبہ دعائے رحمت کیوں کی؟ حضرت نے فرمایا: ''**لانھم لم یکشوا**''

اس لئے کہ ان کے دل میں شک کا گزر نہ ہوا تھا''۔۔۔۔(طبری، ج، ۳،ص ۸۱)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایک جماعت ایسی موجود تھی۔ جس کے دل میں شک پیدا نہیں ہوا تھا۔ اب اگر ہم تاریخ کے اندر یہ فقرات دیکھیں۔ ''**دخل الناس من ذالک امر عظیم**'' لوگوں کے دل میں امر عظیم داخل ہوا۔'' یا یہ کہ رسالت مآبؐ نے کہا تحلیق کرو۔ لیکن **ما قام منھم رجل**۔ کوئی شخص نہ کھڑا ہوا۔

تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ تاریخ کے الفاظ میں کوتاہی کی جھلک ہے اور استثناء نظر انداز ہوگیا ہے یا ابتداء تحلیق کا حکم جس مجمع میں دیا گیا تھا اس میں وہی لوگ موجود تھے کہ جن کے دلوں میں شکوک کا گزر تھا اور دوسرے لوگ اس وقت موجود نہ تھے

---

(۱) طبری، جلد، ۳،ص ۷۷۔

(۲) طبری، ج، ۳،ص ۸۰۔

اور رسالت مآبؐ نے ان کو خاص طور سے حکم دینا ضروری نہ سمجھا تھا۔ اس اطمینان پر کہ ان سے تو جب کہا جائے گا یہ تحلیق کر ہی لیں گے۔

بہر حال صلح ہوگئی اور رسالت مآبؐ نے صلح کر لی۔ کفّار کی انتہائی جابرانہ شرائط کو منظور کر لیا۔ صرف اس بناء پر کہ اگر جنگ ہوتی تو مکہ فتح ہو جاتا مگر یہ کہنے کو ہوتا کہ خود چڑھ کر آئے اور ہمارا شہر فتح کیا۔ لہٰذا آپ نے اس کا موقع نہیں دیا۔ آپ نے صلح کی اور اس کی پابندی اس حد تک فرمائی کہ ابھی یہ تحریر خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ سہیل (نمائندہ صلح) کا لڑکا جو پہلے مسلمان ہو چکا تھا۔ زنجیروں میں گرفتار وامحمداہ وامحمداہ کہتا ہوا آیا اور اپنے کو رسولؐ کے سامنے ڈال دیا۔

سہیل نے جو دیکھا تو کھڑا ہو گیا۔ اس نے طمانچہ لگایا اور گریبان پکڑ کر کھینچتا ہوا لے چلا۔ رسالت مآبؐ خاموش دیکھتے رہے اس نے پکار کر آواز دی۔

''کیوں مسلمانو! کیا میں پھر مشرکین میں واپس کر دیا جاؤں گا۔ کہ وہ مجھ کو میرے دین سے منحرف کریں۔'' حضرتؐ نے کچھ تعرض نہ فرمایا بے شک دل پر اثر ضرور ہوا اور فرمایا:

''اے ابو جندل صبر کر، اس لئے کہ یہ چند دنوں کی تکلیف ہے۔ خدا تیرے لئے اور تمام کمزور مسلمانوں کے لئے جو مشرکین کے پنجہ میں گرفتار ہیں، اپنی طرف سے کشائش پیدا کرے گا۔ ہم نے اس قوم کے ساتھ ایک عہد کر لیا ہے اور ایک پیمان ہو گیا ہے۔ ہم اس کی مخالفت نہیں کر سکتے (۱)''

(یہ فقرہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ آئندہ کی سیرتوں میں ایسے ہی فقرے نظر سے گزریں گے)۔

عہد نامہ مکمل ہو گیا۔ حضرتؐ نے اپنی طرف سے تو اس کی سختی کے ساتھ پابندی کی مگر مشرکین کی طرف سے عہد شکنی شروع ہوئی۔

قبیلۂ خزاعہ آپؐ کا حلیف ہوا تھا۔ اور بنی بکر نے مشرکین کے ساتھ حلیف ہونے کا اعلان کیا تھا۔ جس کا تذکرہ سابق میں ہو چکا۔ ان دونوں قبیلوں میں پہلے سے عداوت تھی، اس لئے دونوں ہی ایک دوسرے کے خلاف تیار رہتے تھے۔ لیکن اب جس وقت کہ رسالت مآبؐ اور قریش کے درمیاں عہد ہو گیا اور خزاعہ رسالت مآبؐ کے اور بنی بکر قریش کے حلیف ہو گئے اور یہ معاہدہ ہوا کہ آپس میں دس برس تک جنگ نہ ہوگی۔ تو اب خزاعہ کے لوگ مطمئن ہو گئے اسلحہ جسم سے اتار ڈالے اور جنگ کی تیاریاں ترک کر دیں یہ موقع بنی بکر کو غنیمت معلوم ہوا اور انہوں نے بنی خزاعہ پر جبکہ وہ ایک چشمہ کے پاس مقیم تھے اچانک حملہ کر دیا اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا۔

قریش کے آدمیوں نے بھی ظاہری طور سے نہیں تو مخفی طور پر ان لوگوں کی امداد کی اور قبیلہ خزاعہ سخت نقصانات سے دوچار ہوا۔

عہد نامہ کے اصول کے مطابق قریش کا فرض تھا کہ وہ بنی بکر اپنے خلفاء کو تنبیہ کرتے اور معاہدہ کے احترام پر مجبور کرتے۔ مگر قریش نے اور ان کی تائید کی اس پر قبیلۂ خزاعہ کا ایک آدمی فریاد کرتا ہوا مدینہ گیا اور رسالت مآبؐ کے سامنے پہنچ کر جب کہ حضرتؐ تمام لوگوں کے مجمع میں مسجد کے اندر رونق افروز تھے، یہ اشعار پڑھنا شروع کئے۔

لاهم انی ناشد محمدا

حلف ابينا وابيه الا تلدا

''خداوند میں یاد دلاتا ہوں محمدؐ کو وہ پیمانِ محبت جو ہمارے اور ان کے آباؤ اجداد کے درمیان رہا کیا۔''

فوالد اكشا و كنت ولدا

ثمت اسلمنا فلم تنزع يدا

''آپ ہمارے درمیان ہمارے بچوں کی طرح پیدا ہوئے، پلے، بڑھے اور بڑے ہوئے پھر آپ نے دعوتِ

---

(۱) طبری، جلد ۳، ص ۷۹، ۸۰۔

اسلام دی تو ہم اسلام لائے، اور آپ کی مخالفت نہیں کی۔''

فانصر رسول الله نصرا عندا

وادع عبادالله یا توا مددا

''اس وقت مدد کیجئے اے خدا کے رسولؐ مضبوط مدد اور خدا کے بندوں کو آواز دیجئے کہ وہ امداد کو آپ کی طرف مجتمع ہوجائیں۔''

فهم رسول الله قد تجردا

ابیض مثل البد رنیمی صعدا

''اس مجمع میں خدا کے رسولؐ بے نقاب صورت سے اس طرح نظر آئے جیسے ماہِ شبِ چہاردہ وفورِ نور وضیاء کے ساتھ''۔

ان سیم خسفا وجهه تر بدّا

فی فیلق کالبحر یجری مزبدا

''رسالت مآبؐ بے جاظلم کو برداشت نہیں کر سکتے اگر کوئی ان کو ذلّت پہچانا چاہے تو غصّہ سے ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہوجائے اور وہ ایسے لشکر کے ساتھ چل کھڑے ہوں جو سمندر کی طرح بہہ رہا ہو۔''

ان قریشا اخلفوک الموعدا

ونقضوا میثاقک الموکدا

''اے خدا کے رسولؐ آپ کو معلوم ہو کہ قریش نے آپ سے عہد خلافی کی اور آپ کے ساتھ جو پیمان ہوا تھا اس کو توڑ دیا گیا۔''

وجعلوا لی فی کداء رصدا

وزعموا ان لست ادعو احدا

''انہوں نے (بنی بکر نے) چشمہ کے کنارہ پر کمین گاہ سے ہمارے اوپر حملہ کر دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہمارا کوئی فریادرس نہیں ہے۔''

وهم اذّل واقلّ عددا

هم بیتونا بالوتر هجّدا

فقتّلو نار کعا و سجّدا

''اگر ہم جنگ کے لیے تیار ہوتے تو بھلا ان کی کیا مجال تھی کہ وہ ہم سے مقابلہ کرتے، وہ تعداد میں بھی کم اور وجاہت کے اعتبار سے بھی بہت حقیر تھے۔ مگر ہم تو نمازِ شب میں مصروف تھے، انہوں نے رکوع وسجود کی حالت میں ہم کو آ کر قتل کیا۔''

یہ چیز ایسی تھی کہ اس کے بعد خاموش رہنا اخلاقی جرم تھا۔ مگر ہوسکتا تھا کہ آپؐ جواب میں مختصر سہی، ایک تقریر فرماتے، کہ ''میں نے جو کچھ، تم نے کہا وہ سنا، اس پر ہمدردی کے ساتھ غور کیا جائے گا۔ بے شک قریش ان واقعات کی بناء پر جو تم نے بیان کیے ہیں، معاہدہ کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں اور اس کا مناسب تدارک ضروری معلوم ہوتا ہے'' عام سیاست دانوں کا انداز یہی ہوتا ہے۔

مگر اس صورت میں مخاطب کو نتیجہ کے حصول میں صبر آزما انتظار کرنا پڑتا ہے۔ حضرتؐ نے اس کے برخلاف اس کی تقریر سنتے ہی مسافتِ کلام کو مختصر کر دیا اور ایک مرتبہ فرمایا کہ ''**قد نصرت یا عمرو بن سالم**'' تمہاری مدد ہوگئی اے عمرو بن سالم''۔ جس کے بعد حضرتؐ نے فوج کشی فرمائی اور نتیجہ فتح مکہ کی صورت میں نمودار ہوا۔

اس صورتِ واقعات سے ظاہر ہے کہ نہ وہ صلح کمزوری کی دلیل تھی اور نہ جنگ بے موقع غیظ وغضب کا نتیجہ۔ بلکہ دونوں باتیں حکیمانہ فرض شناسی کا نتیجہ تھیں اور اس وقت تک رواداری سے کام لیا گیا۔ جب تک حمایت باطل کا سبب نہ ہو اور جب نصرتِ حق کی ضرورت ہوئی تو اس فریضہ کو انجام دیا گیا۔

(جاری)

